غالبؔ کی ایک غزل

اسد اللہ خان غالبؔ اپنی نوعیت کے واحد شاعر ہیں جن کے کلام کو اگر کسی نے ہندوستان کی الہامی کتابوں میں شمار کیا ہے تو خود غالب نے اپنے اشعار میں آنے والے الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہا ہے۔ غالب کے کلام کو ڈیڑھ صدی گذر گئی اور آج بھی ان کے اشعار کی تشریح و تعبیر جاری ہے۔ غالب نے خود کو گلشن ناآفریدہ کا بلبل قرار دیا ہے اور ان کا یہ دعویٰ حرف بہ حرف درست نظر آرہا ہے۔ غالبؔ کے ایک ایک شعر کی مختلف جہات کی جانب ناقدینِ شعریات نے اشارہ کیا ہے اور تشریحات پیش کی ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ سے لیکر شمس الرحمن فاروقی تک جن میں ادباء شعرا سب شامل ہیں۔ سب نے برملا غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور انھیں اپنے زمانے کے روشن ترین دماغوں میں شمار کیا ہے۔

شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبالؔ نے غالب کی عظمت کا اعتراف بڑے ہی کھلے انداز میں کیا ہے۔ یہاں اقبالؔ کا تذکرہ اس لیے مقصود ہے کہ انھیں اسلامی شاعر کے طور جانا جاتا ہے اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمان، اسلام اور اسلام کے گوناگوں شعبوں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ لیکن غالبؔ کی ایک غزل کافی دنوں سے میرے دل ودماغ پر دستک دے رہی تھی اور جب بھی اس غزل کا کوئی شعر ذہن میں آتا غالبؔ کی عظمت کا اعتراف ان کے ولی ہونے کا ثبوت ملتا جارہا تھا۔ غالبؔ نے تجاہل عارفانہ کے ساتھ یہ بات خود کہی ہے:

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ کو ولایت کا درجہ ملا ہوا تھا یا نہیں اس سے قطع نظر ہم ان کی اس غزل کے معنی و مفہوم پر نظر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اپنے آپ میں اسلام کی تفسیر نظر آتی ہے اور اللہ کے ساتھ غالبؔ یا اللہ کے ساتھ ایک مسلمان کے رشتے کا ایسا صوفیانہ اظہار ہے جس پر دم تحریر لنجی اور دم تقریر گونگی نظر آتی ہے۔ غالبؔ کی اس غزل پر بات کرنے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ اقبالؔ کی نظم 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' دونوں اس غزل کی تشریح جان پڑتی ہیں۔ آپ نے بارہا یہ غزل پڑھی ہوگی اس کے کئی اشعار یا پوری غزل ہی آپ کو یاد ہوگی پھر بھی پیش ہے غالب کی وہ معرکۃ الآرا غزل جس کی جانب کم ہی لوگوں کی توجہ اس طرح گئی ہوگی۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کو فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں؟ — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تیری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

مذکورہ پوری غزل ایک کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہ کیفیت مکالمہ سے زیادہ خودکلامی کی ہے۔ شاعری کا مختص منظم بیانیہ ہے لیکن جب اس میں مکالمہ کا انداز شامل ہو جاتا ہے تو اس کا معیار بلند ہو جاتا ہے اور شاعری کی معراج وہ ہے جب یہ خود کلامی کا رنگ اوڑھ لیتی ہے۔ غالبؔ کی یہ غزل مکالمہ اور خودکلامی کا حسین امتزاج ہے جہاں یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے یہ کہاں پر مکالمہ ہے اور کہاں خودکلامی۔ پہلے شعر کو لیں:

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

اس شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو مشکل ہو اور جس کی تشریح و تعبیر کی ضرورت پیش آئے لیکن جیسا کہ غالبؔ نے خود اپنے الفاظ کو گنجینۂ معانی کا طلسم کہا ہے یہاں لفظ عشق، وحشت اور شہرت خاص توجہ کے طالب ہیں۔ عشق ایک ایسا خالص جذبہ ہے جو قدرت کی جانب سے انسان کو ودیعت ہے۔ عشق میں تعلق کی گرمی ہے، ایک احساس لطیف ہے جو کسی طرح قابل مذمت یا سرزنش نہیں بلکہ ایک مستحسن جذبہ ہے جس کی قدر و قیمت کوئی صوفیا کے دل سے پوچھے کہ یہ جذبہ کس قدر بلند اور